جناب محمد طفیل سالک

امام شعرانی کا نظریۂ عبدِ کامل

(۲)

اخلاقِ حمیدہ

عبدِ کامل کا نفس تمام لذائذِ نفسانی اور حظوظِ قلبی سے مرنہ ہو جاتا ہے تا آنکہ اسے ناپسندیدہ افعال اور رصالحہ اخلاق سے کوئی ڈر نہیں رہتا۔ کیونکہ اسے تواضع، فروتنی اور عجز و انکسار ایسے اوصاف پسندیدہ کی دائمی خلعت پہنائی جاتی ہے۔ اس کے دل سے تمام ظلمات دُور ہو جاتے ہیں۔ عیوب و نقائص اسی وقت انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں جبکہ وہ اپنے آپ کو کامل و لائق سمجھتا ہے۔ عبودیت کے مقام پر پہنچ کر انسان اپنے آپ کو خاکسار سمجھنے لگتا ہے۔ تکبر و خود پسندی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ عبودیت کا سارا دارومدار ادب اور فرماں برداری پر ہے۔ جو بے ادب ہوا، راندۂ درگاہ ہوا:

از خدا خواہیم توفیقِ ادب — بے ادب محروم ماند از فضلِ رب
ادب تاجیست از لطفِ الٰہی — بنہ بر سر، برو ہر جا کہ خواہی

ظاہر و باطن کی یکسانیت

عبدِ کامل کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ زبان سے تو خیر کی باتیں ہو رہی ہوں اور دل میں شک و نفاق اور اضطراب و شرارت چھپی ہوئی ہو۔ ایسا دل ہمیشہ نورِ ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ عبدِ کامل اس حدیث نبوی پر پورا پورا عامل ہوتا ہے کہ دین خیر خواہی کا نام ہے الدین النصیحۃ اس لیے وہ ہر ایک کی دل سے بھلائی چاہتا ہے اور کسی کے درپے آزار نہیں ہوتا۔ نہ دوستوں کے، نہ دشمنوں کے۔ دوست ہو یا دشمن وہ ہر ایک سے مروت اور اخلاقِ کریمانہ کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس کے حسنِ نیت اور صدق و اخلاص کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بندگانِ خدا، بلا لحاظ طبقہ و مرتبہ، اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، خود

اس پر عمل بھی کر کے دکھاتا ہے۔ شعرانی فرماتے ہیں کہ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور اس پر عمل نہ کرے، یا عمل کرے اور اس میں اخلاص و ارادت نہ ہو۔

مذمتِ نفس

عبدِ کامل ہمیشہ اپنے نفس کو بُرائی سے متہم رکھتا ہے اور اس کے کسی حال و مقال کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو شخص اپنے نفس کے افعال کو نیک گمان کرتا ہے وہ کسی کی پند و موعظت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے حق میں کہا گیا ہے، وہ اس سے بچا ہوا ہے۔ اسے اپنے میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ اگر وہ اپنے نفس کو عیب دار سمجھتا تو ضرور توبہ و انابت کرتا۔ ایسا آدمی اندھا ہوتا ہے کہ اسے اپنے عیوب نظر نہیں آتے۔

امام شعرانی ایسے زاہدانِ تنگ نظر پر کڑی تنقید کرتے ہیں جو اپنے زہد و تقویٰ کے گھمنڈ میں آ کر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دوسروں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن اپنی خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ خود کس قدر اصلاح کے محتاج ہیں۔ شعرانی کہتے ہیں کہ ایسے زاہد و متقی سے وہ گنہگار اچھا ہے جو اپنے گناہوں پر نادم ہوتا ہے یا جسے کم از کم یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ روسیاہ اور عصیاں شعار ہے۔ معلوم نہیں اس کی مغفرت اور نجات کیونکر ہو گی۔ حضرت شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل ہے کہ جس گناہ سے انکسار و فروتنی پیدا ہو، وہ اس عبادت سے اچھا ہے، جس سے تکبر و غرور پیدا ہو۔

پند و موعظت

عبدِ کامل جب کسی کے حق میں نصیحت کا کلام سنتا ہے تو اسے اپنے لیے سمجھتا ہے اور اس سے عبرت حاصل کرتا ہے لیکن جب وہ خود کسی کو نصیحت کرتا ہے تو کسی خاص آدمی کا نام لے کر ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ کنایتہً اور اشارۃً کلام کرتا ہے اور یہی طریقِ تلقین سب سے بہتر و خوشتر ہوتا ہے: بقولِ عارف رومی:

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

عارفِ صادق جب کسی کو تلقین و ارشاد کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ فخر پیدا نہیں ہوتا کہ وہ مخاطب

سے بہتر ہے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ منصوح، ناصح سے بڑھ جائے۔ یعنی سننے والا زہد و اتقا میں اپنے واعظ سے سبقت لے جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات منکرات اور منہیات میں مبتلا ہونا ہی ترقی کا باعث بن جاتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں انسان اپنے نفس کی حقارت کرتا ہے۔ اس کے دل میں کسی قسم کا عجب و نخوت پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ تکبر و غلو کرتا ہے جس نے ابلیس ایسے زاہد و عابد کو راندۂ درگاہ کر دیا اور روسیاہی اور ذلت کے مستقل جہنم میں بھیج دیا:

تکبر عزازیل را خوار کرد　　بزندان لعنت گرفتار کرد

عظمت و کبریائی خدا کا خاصہ[1] ہے اور اللہ تعالیٰ متکبرین کو کسی صورت میں گوارا نہیں کرتا۔

عبدِ کامل کسی ناصح کی نصیحت سے متغیر اور ناراض نہیں ہوتا، کیونکہ واعظ نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و مقام کے مطابق نصیحت کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔ ناصح کی نصیحت سے ناراض اور برافروختہ ہونا دراصل حماقت ہے اور جہالت اور غرور کی علامت ہے۔ صاحبِ ذوق پر تو لازم ہے کہ واعظ کا احترام کرے اور اس کا شکر بجالائے۔ اس کے اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سنے، نہ یہ کہ سختی اور گرم جوشی سے اس کے مقابلہ پر اُتر آئے۔

جب وہ خود کسی کو امر بالمعروف کرتا ہے یا کسی بُرے اور غیر مستحسن کام سے روکتا ہے اور مخاطب امر کو بجا نہیں لاتا اور نہی سے پرہیز نہیں کرتا تو وہ اس سے مکدر و رنجیدہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا کام ابلاغ ہے نہ کہ ہدایت۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے: ما علی الرسول الا البلاغ (کہ رسول کا کام تو محض پیغامِ ربانی کو پہنچا دینا ہے) چنانچہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وقت ملائمت و مرافقت سے کام لیتا ہے اور کسی کو کسی حال میں حقیر و ذلیل خیال نہیں کرتا۔ اگر لوگ اس کی وعظ و تلقین سے سلوک و رشد حاصل کریں تو وہ اسے محض فضلِ ربانی قرار دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے: انك لا تهدی من احببت

---

[1] : حدیث قدسی ہے: الکبریاء ردائی والعظمت ازاری فمن نازعنی فیھما ادخلتہ فی النار۔

ولکن اللہ یھدی من یشاء۔

وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ واعظ کی طرف سے نرمی و ملائمت ہوگی تو سننے والا ضرور اطاعت کرے گا اور شکریۂ احسان بھی بجالائے گا۔ لیکن اگر نفسانیت، حقارت اور سختی سے تلقین کی جائے تو مخاطب پر کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے پیش آئے گا اور اس طرح سوائے انکار کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور سننے والا تمرد و سرکشی میں پہلے سے بھی بڑھ جائے گا۔ نیز یہ امر مسلّم ہے کہ جو شخص نفسانیت سے خالی ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی کے شایانِ شان ہے اور اسی کو مناسب ہے کہ وہ حدودِ شرعیہ کے قیام کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔ کیونکہ اس حالت میں نفس کی اطاعت سے آزاد ہو کر خالصتاً لوجہ اللہ اور استرضاءً لمرضات اللہ یہ فریضہ سرانجام دے گا۔ خود پرستی و خود غرضی اور عزت و بزرگی کا اسے ذرا بھر احساس نہیں ہوگا۔

خوشامد سے نفرت

عبدِ کامل مدح و ستائش کو پسند نہیں کرتا۔ خود کو حقیر اور عاجز خیال کرتا ہے اور ہر کس و ناکس کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کی جا و بے جا تعظیم اور خوشامد کرتا پھرے۔ اگر اس کی طرف ناقص صفات اور کبیرہ گناہ بھی منسوب کیے جائیں تو ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوتا ہے کہ اس طرح کم از کم اس کے نفس کو تو تادیب و تعذیر ہوگی۔ کسی کو اپنے ہاتھ وغیرہ چومنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی کسی کو اپنے سامنے سرنگوں ہونا گوارا کر سکتا ہے۔ وہ گم نامی و عدم شہرت کو نعمت و رحمتِ الٰہی سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی کے دل میں اس کی تعظیم نہ ہو۔

شعرانی یہاں تفصیل کے ساتھ ایسے آدمیوں کا ذکر کرتے ہیں جو تعظیم و خوشامد کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لوگ ان کے یہاں آتے جاتے ہیں۔ جب وہ اُن سے مدح و خوشامد کے الفاظ سنتے ہیں تو تکبر و بڑائی میں بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان باتوں کا ترک کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے مدعیوں کی پہچان یہ ہے کہ جب لوگ ان کے پاس آنا ترک کر دیں، ہاتھ پاؤں چومنا چھوڑ دیں اور ان کی خدمت و تعظیم میں کوتاہی کرنے لگیں تو ان کا دل خفا ہو جاتا ہے نفس تلملاتا ہے۔ وہ نفس کی ترغیب سے لوگوں کو ایسی حکایتیں سناتے ہیں جن میں ان کے لیے

ادب کی تحریک وتحریص پائی جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ کے مرید اس کے گرد اس طرح بیٹھتے تھے اور اس کا اس قدر ادب بجالاتے تھے کہ کسی کو اس کے پاس بولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں صحابۂ کرام کا بیٹھنا ایسا ہوتا تھا کہ گویا ان کے سروں پر پرندے آکر بیٹھ گئے ہوں، کأنھم علی رؤسھم الطیر۔ ایسی سب باتوں سے مدعی کا منشا یہ ہوتا ہے کہ لوگ یہ سن کر اس کی تعظیم کریں۔ بظاہر زبان سے یوں کہتا ہے کہ ہمیں کسی کے آنے جانے کی پرواہ نہیں ہے۔ فقیر ہر حال میں مست رہتا ہے لیکن اس کے دل سے پوچھیے تو وہ اس سے پھٹا جاتا ہے۔ دل میں یہی آرزو مچلتی ہے کہ لوگ سب سے بڑھ کر اسی کی تعظیم کریں وہ وحید العصر اور یکتائے زمانہ شمار کیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے کسی ہمسر کی بھی ایسی یا اس سے زیادہ تعظیم بجالائیں۔ ایسے لوگ غرض کے بندے اور غرض کے پجاری ہوتے ہیں جنھوں نے لوگوں سے زر وسیم وجواہر کی گٹھیاں بٹورنے کے لیے اور اپنے محل بنوانے کے لیے فقر وتصوف کا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔

اخفا اور کسر نفسی

عبدِ کامل ادب کی رعایت کرتا ہے اور اپنے آپ کو اضعف ترین خلق اللہ شمار کرتا ہے کسی حالت میں شیخی نہیں بگھارتا اور قطبیت وغیرہ کے دعوے نہیں کرتا۔ اگرچہ قربِ الٰہی کے باعث عبدِ کامل سے آثارِ نفسانیت زائل ہوجاتے ہیں اور وہ ہر وقت مشاہدہ ومراقبہ میں مستغرق اور ماسوا اللہ سے غافلِ محض ہوتا ہے، تاہم وہ کبھی ایسے دعوے نہیں کرتا جن سے تزکیۂ نفس یا روحانی مقام ومرتبہ ظاہر ہو، یا کسی طرح سے بھی کبریائی و بزرگی کا پہلو نکلتا ہو۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم تو اس وقت سے انسان بنے ہیں جب سے کہ فلاں شیخ کے حلقۂ ارادت میں آئے ہیں۔ یا یہ کہ کشف وکرامت تو ناقصوں سے صادر ہوتے ہیں، کاملوں کو اس سے کیا واسطہ ونسبت؟ وغیرہ وغیرہ۔

وہ ریا وتکلف اور نمائش وتصنع سے نفرت کرتا ہے۔ اگرچہ نماز مومن کے لیے معراج ہوتی ہے اور اس میں جس قدر زیادہ خشوع وخضوع ہوگا، اسی قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مستجاب ومنظور ہوگی۔ لیکن عبدِ کامل ان ظاہری حرکات سے بھی پرہیز کرتا ہے جن سے کسی طرح سے تصنع کا

پہلو نکلتا ہو۔ مثلاً نماز میں کانپنا، کندھوں کا ہلانا اور سرنگوں ہونا وغیرہ۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو نماز میں کندھے ہلاتے ہوئے دیکھا تو سخت ناراض ہوئے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خشوع کا تعلق دل سے ہوتا ہے نہ کہ جوارح و اعضا سے۔

عیب جوئی و خود نمائی سے پرہیز

عبدِ کامل اپنے ہم سر معاصرین میں سے کسی کے حق میں زبانِ طعن دراز نہیں کرتا بلکہ انھیں نیک نامی سے یاد کرتا ہے۔ ہاں البتہ جھوٹے مدعیوں کے بعض عیوب، جو خلق اللہ کے لیے مضر اور نقصان دہ ہوتے ہیں، ظاہر کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اگر اس کو اپنے شیخ سے یا کسی دیگر کامل سے تلقین کی اجازت مل جائے تو وہ اپنے بھائیوں اور معتقدین کی نصیحت و صلاح سے بے نیاز اور بے پرواہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انھیں صراحتاً اجازت دیتا ہے کہ اگر وہ اس میں کوئی عیب دیکھیں یا اس سے کسی لغزش و غلطی کا ارتکاب ملاحظہ کریں تو فوراً متنبہ کر دیں اور مناسب ہدایت و مشورہ سے بھی گریز نہ کریں۔

وہ لباسِ مشیخت و ہیئتِ بزرگی اور جبّہ و دستار سے مغرور نہیں ہوتا۔ نہ تلامذہ اور مریدین کی کثرت اور ارادت دیکھ کر اپنے آپ کو بہت نیک گمان کرتا ہے۔ عبدِ کامل اپنے ملنے والوں سے شفقت و مہربانی سے پیش آتا ہے اور کبھی ان کی دلآزاری اور رنجیدگی کا باعث نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو بنظرِ استحقار نہیں دیکھتا۔ وہ بیدار مغز اور ذکی الطبع ہوتا ہے۔ ہر ایک شخص سے اس کی استعداد اور قابلیت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ لوگوں کے شیخ شیخ کہنے پر مغرور نہیں ہو جاتا بلکہ خیال کرتا ہے کہ اس نے تو ولایت و مشیخت کی بُو بھی نہیں سونگھی چہ جائیکہ لوگ خواہ مخواہ اس کے لیے خطرہ اور ہلاکت پیدا کرتے پھریں۔

فرقِ مراتب

عبدِ کامل ہر ایک کو اس کے درجہ کے موافق جگہ دیتا ہے اور ہر شخص کی قدر و منزلت کو پہچانتا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ عزت و حرمت وہ شخص ہوتا ہے جو افعال و اخلاق میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا سب سے زیادہ متبع اور پیروکار ہو۔ گویا جس کے اخلاق، اسوۂ حسنہ کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھلے ہوئے ہوں۔ دولت اور جاہ و حشمت کا اس کے یہاں کوئی

مرتبہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایسے لوگوں سے حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کرتا ہے کسی ملک و سلطان اور امیر و حاکم کے دربار میں جانے سے عار ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ آج کل کے بوالہوسوں کی طرح کاسۂ گدائی لیے سلاطین و اُمرا کے دروازوں پر دستک دیتا پھرے۔

مجادلت سے کنارہ کشی

عبدِ کامل کسی سے مجادلت و منازعت نہیں کرتا۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے اور مناظرہ بازی پر اُتر آئے تو وہ فقط ان دو کلمات پر اکتفا کرتا ہے "واللہ اعلم" اور یہ دراصل آیتِ ذیل کی تعبیر ہوتی ہے:

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونًا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلامًا ہ

رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی اور آہستگی (عاجزی و انکساری) سے چلتے ہیں اور جب کبھی جاہلوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو بس یہی کہتے ہیں کہ سلامتی ہو۔

شعرانی فرماتے ہیں "ادب یہی ہے کہ دعویٰ چھوڑ دے۔ ادب میں ہر نیکی کا دروازہ ہے۔ کسی سے مجادلہ و مکابرہ نہ کر ورنہ ہلاک ہو جائے گا۔"

عزیمت و استقامت

عبدِ کامل تمام لوگوں سے تکالیف برداشت کرتا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت پر محمول کرتا ہے۔ بجائے کسی اور طرف مائل ہونے کے، یکسوئی کے ساتھ اللہ رب العالمین کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہایت حلم و تحمل سے مصائب کو برداشت کرتا ہے۔ بعض اوقات اس پر چوری، جھوٹ، مکر و فریب، ایذا رسانی اور ترکِ صوم و صلوٰۃ وغیرہ کے الزام بھی لگتے ہیں لیکن وہ ان کی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اسے زندیق، ملحد اور کافر تک بھی کہہ دیا جاتا ہے لیکن اس کی جبینِ استقامت پر شکن نہیں پڑتی۔ دراصل اس میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کی محبت اس کے دلوں سے محو و زائل کر کے اپنی محبت سے معمور کرتا ہے۔ اگر لوگ ان کی طرف رجوع کریں اور ہر وقت ان کے پاس لوگوں کا جمگھٹا لگا رہے تو اللہ تعالیٰ کی کامل محبت کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ اسی لیے عبدِ کامل مصائب و

تکالیف کو باعثِ شرافت وطہارتِ نفس خیال کرتا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ سنت اللہ ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اپنے انبیا و اصفیا پر ابتدائے امر میں تکالیف و مصائب آتے ہیں اور آخر میں فتح و غلبہ اور شوکت و حشمت ان کے شامل حال ہوتا ہے۔ یہ ولی اللہ پر فراخی و غنا کا زمانہ ہوتا ہے۔ تنگدستی کا دور گزر جاتا ہے اور اسے قبولیتِ عامہ نصیب ہوتی ہے۔

دنیا دارالعمل ہے جب کہ اعمال کی جزا کے ظہور کی جگہ آخرت ہے۔ اس لیے عبدِ کامل لوگوں کے بُرے بھلے کی پرواہ نہیں کرتا اور خلقت سے کسی بدلہ کی امید نہیں رکھتا۔ کامل اپنے کمال و ترقی میں لگ جاتے ہیں اور دنیا میں اس کے نتائج و ثمرات کے ظہور کے طالب نہیں ہوتے۔ ان کا کمال اپنے وقت اور موقعہ پر خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدِ کامل ہر حال میں یکساں رہتا ہے خواہ دنیا بھر کے لوگ اس کی مذمت و حقارت کریں، وہ متغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح خواہ سارا جہان اس کی تعریف میں رطب اللسان کیوں نہ ہو، وہ اتراتا اور بے جا فخر نہیں کرتا۔ اگر اس کے تمام شاگرد اور معتقدین بھی اس سے سرتابی کر کے دوسروں کے پاس چلے جائیں تو اس کی حالت و جمعیتِ خاطر میں سرمو فرق نہیں آتا:

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

کسبِ معاش

عبدِ کامل اپنے مریدین و معتقدین کو صنعت و دست کاری وغیرہ ذرائع سے روزی کمانے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ارادت مند اور حلقہ بگوش صدقہ و خیرات وغیرہ کے سہارے بے کار بیٹھے رہیں اور بھکاری بن جائیں۔ وہ دنیا سے الگ ہو جانے کو ہرگز فقیری نہیں سمجھتا بلکہ دنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کرتا ہے۔ امام شعرانی صاف لکھتے ہیں کہ معروف معنوں میں ترکِ دنیا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ نہیں۔ نیز تجارت اور خرید و فروخت اور دنیا کے امور کی انجام دہی علیٰ وجہ الجائز، زہد کے منافی نہیں۔ صحیح زاہدوں کی دنیا بھی آخرت کے لیے ہوتی ہے اور آخرت محض رب تعالیٰ کے لیے۔ صحابۂ کرامؓ و سلف صالحین کا بھی یہی حال تھا کہ وہ برابر مشاغلِ دینوی مثلاً خرید و فروخت میں لگے ہوئے تھے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ان کی تجارت انھیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی تھی۔ جیسا کہ ارشادِ قرآنی ہے:

رجالٌ لا تلهیھم تجارۃٌ ولا بیعٌ عن ذکر اللہ ۔ وابتغوا من فضل اللہ ۔

یہ لوگ ایسے ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت انھیں یادِ خدا سے غافل نہیں کرتی۔ (اسی طرح) اللہ تعالیٰ کے فضل کو تلاش کرو۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا زر و سیم اور زن و مال سے مرکب نہیں بلکہ یادِ الٰہی سے غفلت کا نام ہے۔ عارفِ رومی نے اسی مضمون کو اپنے مخصوص انداز میں یوں باندھا ہے:

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن! نے قماش و نقرہ و فرزند و زن!

اختیارِ اسباب

اگرچہ سلوک کا ایک مقام اسباب و وسائط کو نظر انداز کر دینا ہے لیکن عبدِ کامل کے نزدیک حکمتِ الٰہی کا مقتضا یہ ہے کہ وسائط و ذرائع کو ضروری سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ اگرچہ وہ صرف انھی پر نہیں ٹھہرتا اور انھیں مقصود بالذات تصور نہیں کرتا۔ اس کا اعتماد مسبب پر ہوتا ہے لیکن وہ اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ سالک قاصر ایک مقام پر پہنچ کر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اسباب و وسائل سے منقطع ہو گیا ہے لیکن عبدِ کامل اس دعویٰ سے خالی ہوتا ہے۔ وہ اس اعتبار سے اسباب کی طرف ملتفت ہوتا ہے کہ ان میں اس کے آقا کی مصلحت ہے اور یہ جانتا ہے کہ تعیین اسباب اور وضع وسائل میں بھی حکمت ہے۔ گویا اس کا اسباب کی طرف مائل ہونا عین ادبِ الٰہی ہے لیکن ایسا مائل نہیں ہوتا کہ بالکل ان میں محو و منہمک ہو جائے۔ اور مسبب سے منقطع اور جدا ہو جائے۔ عارف صادق بایں معنی ماسوا اللہ سے کلیتاً بے نیاز ہوتا ہے کہ وہ صرف اسی کو کارساز گردانتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: لا تتخذوا من دونی وکیلا ۔ (میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ)۔ وہ اس کا قائل ہوتا ہے کہ:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حقوق العباد کی ادائیگی

عبدِ کامل کی توجہ مطالبۂ حقوق کی بجائے ادائے فرائض پر رہتی ہے۔ وہ لوگوں کے حقوق، جو اس سے تعلق رکھتے ہیں، اوّلین فرصت میں ادا کرتا ہے لیکن ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتا۔ خود کسی سے سوال نہیں کرتا اور سائل کا سوال رد نہیں کرتا۔ خواہ اس کے لیے کتنی تنگی اور

سختی برداشت کرنا پڑے۔ وہ مال ذخیرہ نہیں کرتا اور امیروں کی بجائے غریبوں کی صحبت و معیت کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنے کسی ہم عصر کے حق میں زبانِ مذمت دراز نہیں کرتا۔ نہ تصریحاً نہ تعریضاً۔ اپنے ہم عصر مشائخ کے عیوب کو چھپاتا ہے اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے ملنے والوں سے شفقت و مہربانی سے پیش آتا ہے اور کسی صورت میں ان کی دلآزاری و رنجیدگی کا باعث نہیں ہوتا۔ اپنی زہد و ریاضت پر نازاں ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو ہی ذریعۂ نجات سمجھتا ہے اور لوگوں سے امتیازی سلوک اور عزتِ نفس کا طالب نہیں ہوتا کیونکہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ دراصل بندگانِ خدا سے عبادت کا اجر مانگتے ہیں۔

ذکرِ الٰہی کی عمومیت

عبدِ کامل کبھی اس غرور میں مبتلا نہیں ہوتا کہ وہ ذاکر ہے۔ کیونکہ اسے تو تمام کائنات ذکر میں مصروف نظر آتی ہے اس لیے اس میں اسے اپنی کوئی تخصیص دکھائی نہیں دیتی۔ اہلِ کشف و شہود اس حقیقت ثابتہ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرت شعرانی یہاں اپنا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ مغرب سے لے کر ایک تہائی رات تک یہ مشاہدہ کیا کہ تمام کائنات اونچی اونچی آوازوں سے تسبیح و تذکیر میں مصروف ہے۔ میں ان آوازوں کو سن رہا تھا کہ مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے خدشہ محسوس کیا کہ کہیں اس نظارہ سے دیوانہ نہ ہو جاؤں تاآنکہ رب العالمین نے اپنی رحمت و کرم سے وہ نظارہ اٹھا لیا۔ اس حالت میں، میں نے مچھلی کو سنا کہ وہ کہہ رہی تھی:

سبحان الملک القدوس، رب الارزاق۔

مشاہدۂ کائنات، عرفانِ نفس اور معرفتِ حق

عبدِ کامل ملکوت السمٰوٰت والارض میں غور و فکر کرتا ہے اور ان میں ذاتِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ عبدِ کامل کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر ایسے غور و فکر سے پرہیز کرے جس کے لیے وہ مامور نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا مشاہدہ فی حد ذاتہٖ محالات میں سے ہے۔ ہاں اس کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے قلبی بصیرت کو پیدا کرنے اور جلا دینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ عقلوں سے بھی ایسے ہی مستور ہے جیسے کہ آنکھوں سے محجوب ہے۔ جو ذاتِ اقدس غیر محدود اور لامحصور ہے اور جو برابر عرشِ بریں پر بھی ہے تحت الثریٰ پر بھی، وہ تفکر کے احاطہ میں کس طرح آسکتی ہے۔ عرفانِ الٰہی کے لیے معرفتِ نفس اولین زینہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (یعنی وہ تو تمہارے اندر ہے اس پر تم نظر کیوں نہیں کرتے)۔ اقلیم معرفت کے تاجدار سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کا قول ہے کہ خدا نے اپنی معرفت کو نفس کی معرفت پر موقوف رکھا ہے۔ اقبال کا یہ شعر قابلِ غور ہے:

جسے میں ڈھونڈھتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں — وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

مختصر یہ کہ عقل کے ذریعے خالق کا ادراک ناممکنات میں سے ہے۔ اس کے لیے ہمیں باطن کی آنکھ کو کھولنا ہوگا۔ معرفتِ الٰہیہ کے لیے کشف و شہود کا راستہ خود خدا کا بتلایا ہوا ہے۔

قیدِ مقامات سے رہائی

عبدِ کامل مقامات کی طلب و خواہش سے آزاد ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مقامات غیر محصور اور لامتناہی ہیں۔ ان میں پڑے رہنے سے سالک کبھی غایت کار تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسے چاہیے کہ ہر حال کو ہی مقام سمجھے۔ کیونکہ اسے صفاتِ الٰہیہ کا مظہر ہونا چاہیے: کل یوم ھو فی شأن کا اشارہ صاف دلالت کرتا ہے کہ ہر گھڑی مقامات کی مرعیت بدلتی رہتی ہے۔ اصل چیز عبودیت ہے۔ اس تک پہنچنا ہی حقیقت امر کو حاصل کرنا ہے۔ مقصود بالذات اور مطلوب فی نفسہٖ عبودیت ہے جو انبیا و صدیقین کا مرتبہ ہے اور موجودات کی ایجاد کا باعث ہے: وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ..... الآیۃ۔ وہ قیدِ مقامی سے آزاد ہوتا ہے:

فنا کیسی، بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے — کبھی اس گھر میں آنکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ تقرب کی حالت میں عبودیت بذاتِ خود قائم نہیں رہتی کیونکہ صفاتِ عبودیت اور صفاتِ سیادت باہم ضدین ہیں۔ وصل و قرب اتحاد چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالتِ وصل میں صفاتِ متناقضہ جمع نہیں ہوسکتیں اور ذلت و عجز جو مرتبۂ سیادت کے منافی ہے، جاتے رہتے ہیں۔ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ جب قرب و وصل کے حصول میں حیران

ہوئے تو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ارشاد ہوا کہ کیا ایسی چیز سے میرے اصل سے متمنی ہو جو مجھ میں نہیں، یعنی انکسار و افتقار۔ تو حضرت بایزید نے ذل و افتقار کو اپنے نفس سے دُور کر کے قربِ حق حاصل کیا۔ سبحانی ما اعظم شانی۔ کے شطحیات استغراق و محویت کے اسی دُور کی پیداوار ہیں۔ تاہم یہ حال ہمیشہ قائم نہیں رہتا بلکہ عبدِ کامل جلد ہی اپنی اصل حقیقت کی طرف لوٹ آتا ہے جو عبارت ہے نیاز و گداز اور عجز و انکسار سے:

مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ ترک

خلاصہ یہ کہ راہِ عبودیت، عجز و انکسار، خضوع و خشوع، تواضع و فروتنی اور کم بینی و نفس کشی کا راستہ ہے اور یہی راہ تقرب الی اللہ کے لیے سب سے زیادہ سہل ہے۔ بندہ جس قدر خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اسی قدر اس میں دوسروں کی نسبت زیادہ خوف و ادب پایا جاتا ہے۔ عارفِ صادق کا دل ایک لحظہ کے لیے بھی خوفِ خدا سے خالی نہیں ہوتا۔ اُسے ہر وقت تبدیل و تحویل کا ڈر لگا رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص خدا سے ملنا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ عجز و انکسار اور تواضع و فروتنی اختیار کرے اور تکبر و ریا وغیرہ اخلاقِ رذیلہ سے کنارہ کش ہو۔ ہر ایک چیز میں اپنے آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ کا محتاج سمجھے۔ دنیا و آخرت کے حظوظ و خواہشات پر دل نہ لگائے اور نہ ہی کسی مرتبے اور مقام کا دلدادہ ہو۔ عبدِ کامل وہ ہے جو مراتب دینوی و اُخروی، ہر دو میں سے کسی کا طالب نہ ہو۔

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑیے

قرآنِ حکیم میں ہے: ان اصحاب الجنۃ فی شغل فاکھون ھم۔ یعنی قیامت کے دن طالبانِ جنت اپنی اصلی ہستی کو بھول کر میووں وغیرہ لذائذ نفسانی کے شغل میں ہوں گے جب کہ طالبانِ حقیقت، نظارۂ حق میں محوِ تجلّی ہوں گے اور یہی عبدِ کامل کا مطمحِ حیات ہوتا ہے اس کے نزدیک عبادت سے مقصود بالذات معرفتِ الٰہی ہے اور تعمیلِ احکام سے اظہارِ عظمت و جلالتِ خداوندی۔ اس لیے اس کے نزدیک ایسی عبادت جس میں اخلاص نہ ہو اور ایسا زہد جو بے ریا نہ ہو، ہرگز قابلِ قبول اور درخورِ اعتنا نہیں۔

طلب ثواب وخوف عذاب سے اس کا ذہن یکسر خالی اور بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک لذت و ذوق اسی عبادت میں ہے جو بلا غرض و غایت ہو۔ تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر طلب ثواب اور خوفِ عذاب کوئی چیز نہیں تو احادیث میں ترغیبِ عبادات و ترہیبِ محرمات کیوں آتی ہے۔ شعرانی کہتے ہیں کہ یہ مشکل ایک بار مجھے بھی درپیش ہوئی اور میں اس کے حل کی تلاش میں محوِ غور و فکر تھا کہ ایک نبیؑ دوسرے عالم میں نظر آئے اور کہا کہ مخلوقات کے مختلف مدارج ہیں۔ چونکہ ہر ایک کی ہدایت مطلوب ہوتی ہے اس لیے ان کی ہدایت کے اعتبار سے عبادت کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ انبیاءؑ کو ان کے عقل و فہم کے مطابق عبادات کے مراتب، ثواب و عذاب اور حلال و حرام کے مدارج بتلانے پڑتے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ و استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ جب اللہ کے رسول نے یہ رموز بتلائے تو میرے تمام شکوک رفع ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جو شخص ابھی درجۂ معرفت تک نہیں پہنچا اس کے لیے طلبِ ثواب اور خوفِ عذاب کے پیشِ نظر عبادت کرنا ہی بہتر ہے۔ بحالت دیگر وہ نکاتِ معرفت کے جاننے سے گمراہ ہو سکتا ہے۔

کمالِ عبودیت

مختصر یہ کہ عبدِ کامل صدق و خلوص کے ساتھ اور کسی غرض و غایت کے بغیر عبادت ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا ماٹو یہ آیۂ کریمہ ہوتی ہے:

فاعبد اللہ مخلصًا لہ الدین الا للہ الدین الخالص۔

نیاز و گداز کے ساتھ عبادت کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کے اندر عاجزی و انکساری (جو تمام اخلاقِ محمودہ کی جان ہے) اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا احساس پختہ ہو جاتا ہے اور وہ اطمینانِ قلب کی دولتِ لازوال سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ کسی شے کے فوت ہو جانے سے غم نہیں کھاتا کیونکہ اسے ہر طرح سے اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔ ہمیشہ راضی برضا رہتا ہے اور اپنے ارادہ کو ارادۂ الٰہی میں فنا کر دیتا ہے جو سلوک و معرفت کا سب سے آخری مقام اور منتہائے مقصود ہے۔ یہی درجہ عبودیت کا کمال ہے اور یہی انسانیت کا ارتقاء و معراج ہے کہ اپنے ارادہ کو ارادۂ الٰہی کے تابع کر دیا جائے یہاں تک کہ سمع و بصر کی قوتیں بھی بجز اشارۂ

ایزدی کے حرکت میں نہ آئیں۔ جیسا کہ مشہور حدیث قدسی میں ہے:

ما زال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبہ، فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ الذی یبطش بھا ورجلہ الذی یمشی بھا [1]

(یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) جب میرا بندہ کثرت نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ اور آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں جس سے وہ چلتا پھرتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف، ج اول، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ والتقرب۔

ارمغانِ شاہ ولی اللہ رح

مرتبہ: محمد سرور

حضرت شاہ ولی اللہ نے جملہ علوم دینی کو حکمت کے عقلی اصولوں پر مرتب فرمایا اور اپنی تصانیف میں علوم تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے ملت کی سیاسی تاریخ کا بھی تجزیہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں، ان سب میں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں "ارمغانِ شاہ ولی اللہ" میں شاہ صاحب کی ان ہی تعلیمات و افکار کو مرتب کیا گیا ہے۔ نیز اس میں شاہ صاحب کے اور ان کے بزرگوں کے خود نوشت سوانح حیات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی عربی و فارسی کتب کے انتخاب کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف شاہ صاحب کی جلیل القدر شخصیت کا ایک اجمالی تعارف ہے۔ بلکہ آپ کی ضخیم کتابوں کا ماحصل بھی ہے۔

صفحات: ۵۲۰ قیمت: ۱۹ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور